زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کی خوبیاں اور اُن کا پس منظر

از

سیدنا حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کی خوبیاں اور اُن کا پس منظر

(فرمودہ ۲۶، ۲۷ مئی ۱۹۴۷ء بعد نماز مغرب بمقام قادیان)

مکرم السید منیر الحصنی صاحب نے ۲۱ ؍مئی بعد نماز مغرب زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کے مناقب کے موضوع پر عربی میں تقریر کی تھی مگر چونکہ وقت کم رہ گیا تھا اس لئے دوستوں کو سوالات کا موقع نہ مل سکا۔ ۲۶ ؍مئی بعد نماز مغرب جب مجلس منعقد ہوئی تو حضور نے فرمایا:۔

میں دو تین دن سے نزلہ وزکام سے بیمار ہوں اس لئے آج کچھ زیادہ بول نہیں سکتا۔ السید منیر الحصنی صاحب کا لیکچر تو اُس روز ہو گیا تھا مگر سوالات کا حصہ رہ گیا تھا اِس کے متعلق دوستوں کو اب موقع دیا جاتا ہے اگر دوستوں نے کچھ سوالات کرنے ہوں تو وہ کر سکتے ہیں۔

(اس پر تین دوستوں نے سوالات کئے اور معزز لیکچرار نے ان کے جوابات دیئے اس کے بعد حضور نے فرمایا۔)

مجلس میں بہت سے لوگ ایسے بھی بیٹھے ہیں جو عربی نہیں جانتے اور وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکے ہوں گے کہ سوال کرنے والوں نے کیا سوالات کئے ہیں اور جواب دینے والے نے کیا جوابات دیئے ہیں مجھے نزلہ کی شکایت تو ہے لیکن مَیں کچھ باتیں آج بیان کر دوں گا اور باقی پھر کسی وقت بیان ہو جائیں گی۔ یہ تقریر جو منیر الحصنی صاحب نے کی ہے اِس کا مفہوم یہ ہے کہ عرب کے لوگوں میں قبل از اسلام بھی بعض خوبیاں پائی جاتی تھیں اور جن دوستوں نے اعتراضات کئے ہیں انہوں نے کہا ہے کہ آیا یہ خوبیاں اُن عربوں میں عام تھیں یا خاص۔ اگر یہ خوبیاں ان میں عام پائی جاتی تھیں تو قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم جو ہم لیتے ہیں غلط قرار پاتا ہے کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ [1] اور اگر وہ خوبیاں خاص خاص لوگوں میں

پائی جاتیں تھیں تو کچھ خوبیاں تو قریباً ہر قوم میں ہی پائی جاتی ہیں اور اس وجہ سے عربوں کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ جہاں تک میں نے سوالات کرنے والے دوستوں اور لیکچرار کے نقطۂ ہائے نگاہ کے متعلق اندازہ لگایا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں کو ہی غلط فہمی ہوئی ہے۔ نہ تو سوال کرنے والے ان کی تقریر کو صحیح طور پر سمجھ سکے ہیں اور نہ لیکچرار نے ان کے سوالات کو سمجھا ہے اور دونوں غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔

مثنوی میں مولانا روم ایک مثال بیان کرتے ہیں کہ کسی جگہ چار فقیر تھے ان میں سے ایک ہندی تھا، دوسرا ایرانی، تیسرا عرب اور چوتھا تُرک۔ وہ چاروں بازار میں اکٹھے ہو کر لوگوں سے خیرات مانگتے رہے مگر کسی نے انہیں کچھ نہ دیا۔ جب شام ہوئی تو کوئی شخص اُن کے پاس سے گزرا اور جب انہوں نے سوال کیا تو اُسے ان کی حالت پر رحم آیا اور اس نے انہیں ایک پیسہ دے دیا مگر چونکہ پیسہ ایک تھا اور فقیر چار تھے اس لئے انہوں نے آپس میں جھگڑنا شروع کر دیا۔ ہندی کہتا تھا میں صبح سے گلا پھاڑ پھاڑ کر سوال کرتا رہا ہوں اس لئے پیسہ میری خواہش کے مطابق خرچ کیا جائے اور اس پیسہ کی داکھ[۲] خریدی جائے گی۔ عرب کہنے لگا تم غلط کہہ رہے ہو پیسہ دینے والے نے میری ہی حالت پر رحم کھا کر پیسہ دیا ہے اس لئے پیسہ میری مرضی کے مطابق خرچ ہوگا اور اس کی داکھ نہیں بلکہ عِنَب[۳] خریدا جائے گا، ایرانی نے کہا تم دونوں غلط کہہ رہے ہو یہ پیسہ میری مرضی سے خرچ ہوگا اور نہ داکھ خریدی جائے گی اور نہ عِنَب بلکہ انگور خریدا جائے گا۔ یہ سن کر تر کی سخت چیں بجبیں ہوا اور کہنے لگا تمہاری تینوں کی رائے غلط ہے۔ یہ پیسہ میری مرضی کے سِوا خرچ نہیں ہوسکتا اور اُس نے تر کی زبان میں انگور کا نام لے کر کہا کہ میں وہ خریدنا چاہتا ہوں۔ اس پر انہوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا اور ان میں سے ہر شخص چاہتا تھا کہ میری بات مانی جائے اور میری خواہش کے مطابق چیز خریدی جائے۔ وہ آپس میں جھگڑ ہی رہے تھے کہ ایک شخص پاس سے گزرا جو اُن چاروں کی زبانیں سمجھتا تھا اُس نے پاس کھڑے ہو کر ان کی باتیں سُنیں اور کہا آؤ میں تمہارے جھگڑے کا فیصلہ کر دوں اور ہر ایک کی خواہش کے مطابق چیز خرید دوں۔ یہ کہہ کر وہ ان کو ساتھ لے گیا اور جا کر انگور خرید دیئے اور وہ سب خوش ہو گئے۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ سب ایک ہی چیز مانگ رہے تھے مگر وہ ایک دوسرے کی زبان نہ

سمجھنے کی وجہ سے آپس میں لڑ رہے تھے۔ اسی طرح بعض اوقات اختلاف کی بنیاد محض غلط فہمی پر ہوتی ہے اور فریقین آپس میں جھگڑا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ نہ وہ اس کے نقطۂ نگاہ کو سمجھ رہا ہوتا ہے اور نہ وہ اس کے نقطۂ نگاہ کو، اور وہ آپس میں لڑتے چلے جاتے ہیں لیکن اگر ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھ لیا جائے تو اختلافات کی بنیاد اُٹھ جانے سے کوئی مشکل نہیں رہتی۔ مثلاً یہ لاؤڈ سپیکر ہے اس کا جو حصہ میرے سامنے ہیں اس پر تارے سے ہیں اور پیچھے والا حصہ سیاہ ہے اگر میں کہہ دوں کہ لاؤڈ سپیکر پر تارے سے ہیں اور آپ لوگ کہنا شروع کر دیں کہ تارے تو نہیں بلکہ یہ تو سیاہ ہے تو باوجود یکہ ہم دونوں ٹھیک کہہ رہے ہوں گے ہم بحث کرتے چلے جائیں گے میں یہ کہتا رہوں گا کہ یہ سیاہ نہیں بلکہ اس پر تارے ہیں اور آپ کہتے رہیں گے ہمیں تو اس پر تارے نظر نہیں آتے ہمیں تو صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ سیاہ ہے۔ اور بات صرف اتنی ہوگی کہ جدھر میں بیٹھا ہوں اُس طرف تارے ہیں اور جدھر آپ بیٹھے ہیں اُس طرف سے سیاہ ہے۔ نقطۂ نگاہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جہاں سے کوئی چیز نظر آ رہی ہو۔ ہر مربعہ چیز کے چھ جہت ہوتے ہیں آگے پیچھے دائیں بائیں اور نیچے اوپر۔ اگر اس چیز کی چھ کی چھ جہتیں مختلف رنگوں کی ہوں تو جب اس کی مختلف جہتوں کو مختلف آدمی دیکھیں گے تو لازماً ان کی رائیں مختلف ہوں گی مثلاً اس کی چھ جہتوں پر مختلف رنگ ہیں زرد، سرخ اور پیلا، سیاہ اور سفید تو اب جو شخص زرد حصہ کے سامنے ہوگا وہ کہے گا اِس کا رنگ زرد ہے اور جس شخص کی نظر کے سامنے سرخ حصہ ہوگا وہ کہے گا زرد نہیں ہے اس کا رنگ سرخ ہے، پھر نیلے حصہ کو دیکھنے والا کہے گا تم دونوں غلط ہو نہ یہ زرد ہے نہ سرخ بلکہ صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ چیز نیلی ہے۔ اس طرح چھ جہات کو دیکھنے والے مختلف آراء قائم کریں گے اور ان میں سے ہر ایک سچ بول رہا ہوگا۔ اس جھگڑے کو ختم کرنے کا یہ طریق ہوگا کہ سرخ کہنے والے کو سبز حصہ کی طرف لایا جائے اور نیلا کہنے والے کو سرخ اور سبز حصے دکھائے جائیں ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جھگڑتے چلے جائیں گے اور ایک دوسرے کی بات نہیں مانیں گے ان میں سے ہر ایک حق پر بھی ہوگا اور ناحق پر بھی۔ حق پر اس طرح کہ جو حصہ اُسے نظر آ رہا ہے وہ واقعی وہی ہے جو وہ کہتا ہے مگر جو حصہ دوسرے کو نظر آ رہا ہے وہ بھی واقعی وہی ہے جو دوسرا کہہ رہا ہے۔ پس ہر ایک چیز کی ایک بیک گراؤنڈ (Back Ground) ہوتی

ہے جس کو پسِ پردہ بھی کہا جا سکتا ہے جب تک اسے مدنظر نہ رکھا جائے انسان اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔

اصل بات یہ ہے کہ منیر الحصنی صاحب شام سے آئے ہوئے ہیں اور اِس وقت شام اور لبنان میں ایک تحریک پیدا ہو رہی ہے جس سے وہ متأثر ہیں اور اسی سے متأثر ہو کر انہوں نے یہ مضمون بیان کیا ہے لیکن اِس امر کو میں بعد میں کسی وقت بیان کروں گا پہلے میں پس پردہ والے حصہ کو لیتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عرب میں کچھ عیسائی آباد ہیں اور کچھ مسلمان، عیسائی کم ہیں اور مسلمان زیادہ ہیں۔ جب عربوں کا ترکوں کے ساتھ اختلاف ہوا اور عربوں نے دیکھا کہ ترک ہمیشہ ہم پر مظالم کرتے آئے ہیں اور انہوں نے ہماری آزادی کی راہ میں رُکاوٹیں ڈالی ہیں تو ان کے اندر حریت اور آزادی کی روح بیدار ہوئی۔ سیاسی طور پر جب کسی ملک میں آزادی کی روح پیدا ہو تو وہ ساری قوموں کے اتحاد کی خواہاں ہوتی ہے۔ جب عربوں کے اندر آزادی کی روح پیدا ہوئی اور اُنہوں نے بلا لحاظ مذہب وملت ایک ہونا چاہا تو جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف مستقبل کے حالات پر نظر کر کے قومیں ایک نہیں ہو سکتیں بلکہ اتحاد کے لئے ماضی کی روایات پر بھی حصر کیا جاتا ہے اور پُرانی باتوں کو تاریخوں سے نکال نکال کر کہا جاتا ہے کہ ہم ایک ہیں اس لئے ہمیں دشمن کے مقابلہ میں متحد ہو جانا چاہئے۔ یہی تحریک ہندوستان کے لوگوں میں بھی پیدا ہوئی اور انہوں نے انگریزوں کے خلاف متحد ہونا چاہا اور اتحاد کی کوشش کی گئی۔ مگر بجائے اس کے کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ رواداری سے پیش آتے اور ایک قوم بننے کی کوشش کرتے انہوں نے مسلمانوں کے بزرگوں کی عیب چینی شروع کر دی اور ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے اس لئے اتحاد نہ ہو سکا کیونکہ کسی قوم کے بزرگوں کی عیب چینی کرنے سے کب اتحاد ہو سکتا ہے۔ جو جڑ ماضی میں اکٹھی رہی ہو اُس کی شاخیں بھی اکٹھی رہ سکتی ہیں اور اگر جڑ ہی علیحدہ ہو تو شاخیں کس طرح اکٹھی ہو سکتی ہیں۔ اگر ایک قوم اپنے آپ کو الگ قرار دے دے اور دوسری الگ تو اتحاد کس طرح ہو سکتا ہے۔ عرب کے متعصّب عیسائی پادریوں نے جب دیکھا کہ اتحاد کی کوششیں ہو رہی ہیں تو انہوں نے اس سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہا اور انہوں نے یہ

کوششیں شروع کر دیں کہ عرب چاہے متحد ہو جائے لیکن عیسائیت کو غلبہ حاصل ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اِسی قسم کے متعدد پادریوں کی بعض کتابیں پڑھی ہیں جن میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عربی زبان اصل میں اریمک یعنی آرامی زبان ہے اور اسی زبان کی مدد سے عربی زبان نے ترقی اور ارتقاء حاصل کیا ہے۔ ان عیسائی مصنفین نے عربی الفاظ اریمک زبان کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً اِستفعال کا لفظ ہے، انہوں نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ است اریمک لفظ ہے اور اسی سے عربوں نے اِستفعال بنالیا ہے یا ان اریمک لفظ ہے اور اسی سے عربوں نے اِنفعال بنا لیا ہے حالانکہ جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِس موضوع پر بحث فرمائی ہے حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان اپنے اندر بہت بڑا فلسفہ رکھتی ہے اور یہ فلسفہ کسی اور زبان میں نہیں پایا جاتا۔ مثلاً دوسری زبانوں میں الفاظ زبان کی اصل ہیں لیکن عربی زبان میں الفاظ نہیں بلکہ حروف زبان کی اصل ہیں۔ شرب عربی زبان میں پینے کو کہتے ہیں[۴] مگر یہ معنی شرب کے نہیں بلکہ ش ر ب کے ہیں چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ش ر ب کسی ترتیب سے عربی میں آجاویں ان کے مرکزی معنی قائم رہیں گے خواہ ش رب ہو، خواہ ش ب رہو، خواہ رب ش ہو۔ غرض ہر حالت میں مرکزی معنی قائم رہیں گے گویا عربی زبان میں حروف، ترتیب حروف اور حرکاتِ حروف کے مجموعہ سے لفظ کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ قاعدہ ایسا ہے کہ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے جب قدیم ترین زبانوں کو دیکھا جائے تو قاعدہ ابدال کے مطابق تغیرات کے ساتھ ہزاروں ایسے الفاظ ان میں پائے جاتے ہیں جو اصل میں عربی ہیں اور چونکہ ان لفظوں کو نکال کر وہ زبانیں بالکل بے کار ہو جاتی ہیں اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ وہ زبانیں مستقل نہیں بلکہ عربی سے ہی متغیر ہو کر بنی ہیں لیکن انہوں نے اریمک زبان کو عربی زبان پر فضلیت دینے کے لئے یہ کہہ دیا کہ عربی زبان نقل ہے اریمک زبان کی، جو درحقیقت یہودیوں کی زبان تھی۔ دوسری تدبیر انہوں نے یہ کی کہ یہ کہنا شروع کر دیا کہ عرب کے مشہور اور اعلیٰ درجہ کے تمام شعراء عیسائی تھے۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں انہوں نے قیس اور اخطل اور دوسرے شعراء کے نام پیش کر دیئے اور کہا کہ عرب کے اعلیٰ درجہ کے شاعر سب عیسائی تھے اور انہوں نے ہی عربی زبان کو معراجِ کمال تک پہنچایا ہے۔ گویا اس وجہ سے کہ مسلمان چاہتے

تھے ہم ترکوں کے مقابلہ میں متحد ہو جائیں عیسائی پادریوں نے جو سخت متعصّب تھے سمجھا کہ اس سے زیادہ اچھا موقع عیسائیت کے غلبہ کا اور کوئی ہاتھ نہ آئے گا اور یہ ایسا وقت ہے کہ ہم جو کچھ بھی کہیں گے مسلمان قبول کرتے جائیں گے اور ہماری کسی بات کی تردید نہیں کریں گے۔ اُس وقت حالت بالکل ایسی ہی تھی کہ اگر مسلمان عیسائیوں کی ان باتوں کی تردید کرتے اور کہتے کہ شعراء تمہارے نہیں بلکہ ہمارے اچھے ہیں تو آپس میں اُلجھ کر رہ جاتے اس لئے مسلمانوں نے اِسی میں اپنی بھلائی سمجھی کہ ان کی کسی بات کی نفی نہ کی جائے تا کہ یہ ہم سے خوش ہو جائیں۔ پس مسلمانوں کی اِس مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے متعصب عیسائیوں نے اپنی کتابوں میں بے حد مبالغہ سے کام لیا اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ عربی لغت اریمک کی ممنونِ احسان ہے اور عربی زبان میں جس قدر ترقی ہوئی ہے وہ عیسائی شعراء کے ذریعہ ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدائی زمانہ میں شاعری ابھی پورے طور پر مدون نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے عرب شعراء کے کلام میں بعض اوقات وزن کے لحاظ سے اس قسم کی غلطیاں ہو جاتی تھیں جیسے اردو میں کوئی شخص جمال اور جلال کہتے کہتے چنار کہہ جائے مگر بعد کا ارتقاء یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس ارتقاء میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔

اگر غور سے کام لیا جائے تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ مسلمانوں نے زبان کو اعلیٰ درجہ کے نقطۂ کمال تک پہنچایا ہے چنانچہ اسی وجہ سے متعصب عیسائیوں کے مقابلہ میں خود عیسائیوں اور مسلمانوں کے اندر ایک اور طبقہ پیدا ہو گیا۔ متعصب عیسائی تو یہ کہتے تھے کہ ترقی اور ارتقاء ختم ہو گیا ہے عیسائی شعراء پر۔ مگر درمیانی طبقہ کے عیسائی کہتے تھے کہ ترقی اور ارتقاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جاری رہا۔ اسی طرح مسلمانوں کا طبقہ تو کہتا تھا کہ ترقی اور ارتقاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی تھا اور عربوں میں بھی یہ خوبیاں پائی جاتی تھیں گو یہ ارتقاء بعد میں بھی جاری رہا چنانچہ بعض عیسائیوں نے اس کے متعلق کتابیں بھی لکھی ہیں کہ ارتقاء اسلامی تمدن کے وقت بھی جاری رہا، یہ درست نہیں کہ مسلمانوں نے زبان میں کوئی اصلاح اور تجدید نہیں کی۔ غرض ایک حصہ عیسائیوں کا اور ایک حصہ مسلمانوں کا اس نقطۂ نگاہ پر متفق ہو گیا کہ اسلام سے پہلے بھی عربوں میں خوبیاں پائی جاتی تھیں اور بعد میں بھی یہ خوبیاں جاری رہیں اور

اس کی وجہ خالص سیاسی اتحاد تھا۔ عیسائیوں نے اس امر کو تسلیم کر لیا کہ اسلام کے آنے پر بھی ترقی اور ارتقاء جاری رہا اور مسلمانوں نے تسلیم کر لیا کہ اسلام سے پیشتر بھی عربوں میں خوبیاں موجود تھیں پس یہ ہے اس موضوع کا پس منظر۔ باقی رہا اصل سوال تو وہ یہ ہے کہ اگر اسلام سے پیشتر بھی عربوں کے اندر خوبیاں پائی جاتی تھیں تو اسلام کی فوقیت اور اُس کا مَابِہِ الْاِمتیاز طُرّہ کیا ہوا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ کسی قوم کے اندر بعض خوبیاں چاہے وہ قومی ہوں یا انفرادی پایا جانا اور بات ہے اور ایک ایسی خوبی اس کے اندر ہونا جو اُسے تمام دنیا کا اُستاد بنا دے اور بات ہے۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ عربوں کے اندر پہلے کوئی خوبی نہ تھی اور نہ ہی ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ کا یہ مفہوم ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں میں کوئی خوبی نہ تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ خوبیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو ہوتا ہے ذاتی کیریکٹر یعنی ہر قوم اپنے حالات کے لحاظ سے ایک چیز کو لے لیتی ہے اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیتی ہے۔ مثلاً حدیثوں اور تاریخوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب قوم اسلام سے پہلے بھی مہمان نواز تھی مگر ہم دوسری طرف دیکھتے ہیں کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کا نزول ہوا اور آپ گھبرائے ہوئے گھر پہنچے اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ تو حضرت خدیجہؓ نے کہا کَلَّا اَبْشِرْ فَوَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْکَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَصْدُقُ الْحَدِيْثَ وَ تَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَ تَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ [۵] یعنی آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا کیونکہ آپ میں کئی خوبیاں پائی جاتی ہیں چنانچہ منجملہ اور خوبیوں کے حضرت خدیجہؓ نے یہ بھی کہا کہ خدا آپ کو اِس لئے نہیں چھوڑے گا کہ آپ مہمان نواز ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اِدھر حدیثوں سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ عرب آپ کی بعثت سے پہلے بھی مہمان نواز تھے اُدھر حضرت خدیجہؓ نے آپ کی یہ خوبی بیان کی ہے کہ آپ مہمان نواز ہیں جب سارا عرب مہمان نوازی کرتا تھا تو حضرت خدیجہؓ نے امتیازی رنگ میں آپ کی مہمان نوازی کا ذکر کیوں کیا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کی یہ خوبی اسی لئے بیان کی کہ یہ آپ کو دوسرے عربوں پر ممتاز کر دیتی تھی۔ یوں تو مہمان نوازی عربوں میں عام پائی جاتی تھی اور حاتم طائی کے متعلق بھی بہت سی باتیں مشہور ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اس کے پاس

ایسی حالت میں پہنچا جبکہ وہ ایک سفر میں تھا جب اُس نے دیکھا کہ میرے پاس اور کوئی چیز مہمان کو کھلانے کے لئے نہیں ہے تو اس نے اپنی اونٹی ذبح کر دی جس پر وہ سفر کر رہا تھا۔ پس جب عربوں میں بھی مہمان نوازی پائی جاتی تھی تو اب دیکھنے والی بات یہ ہے کہ عربوں کی مہمان نوازی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مہمان نوازی میں کیا فرق ہوا۔ عربوں کے اندر یہ خوبی پائے جانے کے باوجود حضرت خدیجہؓ آپ سے کہتی ہیں کہ آپ کے اندر مہمان نوازی کی خوبی بھی پائی جاتی ہے جو عربوں میں نہیں ہے حالانکہ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے عربوں کی مہمان نوازی کا ذکر فرمایا ہے فرماتا ہے **یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا** [۶] یعنی وہ فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مَیں نے اپنی قوم کے لئے ڈھیروں ڈھیر روپیہ خرچ کیا ہے۔

پس عرب لوگ فخر کیا کرتے تھے کہ ہم مہمان نواز ہیں مگر ان کی مہمان نوازی کے پیچھے جو روح کام کرتی تھی اگر اس کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مہمان نوازی بعض حالات کے ماتحت تھی وہ بدوی لوگ تھے اور سفر کرتے رہتے تھے اس لئے وہ اپنے حالات کے ماتحت مجبور تھے کہ یہ خوبی اپنے اندر پیدا کرتے ان کی اس خوبی کے پیچھے یہ روح کام نہ کر رہی تھی کہ ان کو بنی نوع انسان کی خدمت کا خیال تھا یا بھوکے اور فاقہ مستوں کا پیٹ بھرنے کا خیال تھا اور نہ ہی ان کے دلوں کے اندر یہ جذبہ پایا جاتا تھا کہ وہ خدا کے بندوں کو رزق کھلا رہے ہیں بلکہ ان کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ ہم کھلائیں گے تو کوئی دوسرا ہمیں بھی کھلائے گا اور وہ کھلائیں گے تو ہم بھی کھلائیں گے۔ ہمارے مولوی سید سرور شاہ صاحب یہاں بیٹھے ہیں یہ ہزارہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے ہم وطن جلسہ پر آتے ہیں تو واپس جاتے ہوئے کہتے ہیں کہ لائیے ہمارا کرایہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے علاقہ میں ریل نہیں اور لوگ جنگلوں میں سفر کرتے ہیں اور چونکہ جنگلوں میں ڈاکے اور لُوٹ مار کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے لوگ سفر پر جاتے وقت اپنے ساتھ بستر یا نقدی وغیرہ نہیں لے جاتے اور جہاں ان کو شام ہو جاتی ہے وہیں کوئی نزدیک گاؤں دیکھ کر کسی کے گھر چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لاؤ روٹی اور پھر چلتے ہوئے اُس سے اپنی ضرورت کے لئے روپیہ بھی لے لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے علاقہ میں ہر شخص کے گھر میں بیسوں بستر اور چارپائیاں موجود ہوتی ہیں اور ہر شخص سمجھتا ہے کہ خواہ کتنے بھی مہمان آ جائیں اُن کو روٹی

اور بستر دینا میرا فرض ہے۔ ان لوگوں نے اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے آپس میں یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ سفر کی حالت میں زید مجھ سے روپیہ لے جائے گا تو میں اس سے روپیہ لے آؤں گا اپنے گھر سے ساتھ کچھ نہیں لے جائیں گے۔ اب اگر کوئی شخص ان باتوں کو مناقب ہزارہ کے طور پر بیان کرنے لگ جائے تو کہاں تک درست ہوسکتا ہے۔ یہ تو ان کا قومی کیریکٹر ہے جو مخصوص حالات نے پیدا کیا ہے اور وہ اس کے لئے مجبور ہیں کیونکہ اس کے سِوا ان کا کام چل ہی نہیں سکتا ان کا یہ خُلق طبعی اور اقتصادی حالات سے پیدا ہوا ہے مگر ہم اسلامی تعلیم کی روشنی میں اس کا نام خُلق نہیں رکھ سکتے زیادہ سے زیادہ اس فعل کو حسین کہہ سکتے ہیں مگر خُلق فاضل نہیں کہہ سکتے۔ خُلق وہ ہوتا ہے جو الٰہی حکم کے ماتحت ہو اور اعلیٰ مقاصد کو اپنے اندر لئے ہوئے ہو۔

پس بے شک عربوں کے اندر مہمان نوازی تھی مگر وہ اسی قسم کے اقتصادی حالات کے ماتحت تھی اور وہ مجبور تھے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل چونکہ وہ اعلیٰ مقاصد اپنے اندر لئے ہوئے تھا اس لئے آپ کا یہ فعل ایک نئی چیز بن گئی اور یہ فعل خُلق کہلایا۔ بعض اوقات انسان کسی چیز کی شکل اور اس کے بیرونی حصہ کو دیکھ کر اس کی خوبیوں کے متعلق غلط اندازہ لگا لیتا ہے اور بعض دفعہ ایک چیز کو وہ اعلیٰ سمجھتا ہے لیکن وہ نہایت ناقص ہوتی ہے۔ میرے پاس حال ہی میں ایک رسالہ امریکہ سے آنا شروع ہوا ہے جو کسی دوست نے میرا نام لکھوا دیا ہے اس میں تین تصویریں دکھائی گئی ہیں اور ساتھ لکھا ہوا ہے کہ ان کی شکلیں دیکھ کر بتایا جائے کہ ان میں سے اچھا کون ہے اور بُرا کون۔ اور دوسرے صفحہ پر ان کی اصل حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔ میں نے بھی ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ لگانا شروع کیا تو جس تصویر کے متعلق میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ نہایت شریف ہے اس کے متعلق دوسری طرف پڑھا تو لکھا تھا کہ یہ مشہور ڈاکو ہے اور جس کے متعلق میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ ڈاکو ہے اس کے متعلق لکھا تھا کہ یہ پرلے درجہ کا شریف انسان ہے۔ عام طور پر خونریزی اور فساد کرنے والے لوگوں کے چہرے خراب ہو جاتے ہیں مگر بعض لوگوں نے فن بنایا ہوتا ہے کہ باوجود اس قسم کے افعالِ قبیحہ کے ان کے چہرے خراب نہیں ہوتے۔ اس رسالہ والوں نے بھی لاکھوں ڈاکوؤں میں سے ایک کو چن کر دِکھا دیا جس کا چہرہ شریفوں والا نظر آتا تھا اور لاکھوں شریفوں میں سے ایک کو چن لیا جس کا چہرہ باوجود شرافت کے

شرارت ظاہر کرے چنانچہ میں نے ان تصاویر کے متعلق جس قدر اندازے لگائے ان میں سے اکثر غلط نکلے۔ اب دیکھو تصویر کو دیکھ کر انسان اندازہ لگاتا ہے کہ شکل تو اچھی ہے مگر حقیقت یہ ہوتی ہے کہ شکل والا خود اچھا نہیں ہوتا۔ پس فعل حسن اور چیز ہے اور اخلاق اور چیز ہے۔ کوئی فعل اپنی ذات میں اچھا ہو اور خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا گیا ہو تم ہم اس کو تو خُلق کہیں گے لیکن جو فعل اپنی ذات میں تو اچھا ہو لیکن مجبوری کے ماتحت ہو تو گو وہ فعل حسن کہلائے گا لیکن خُلق نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح بعض افعال بظاہر بُرے نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اچھے ہوتے ہیں۔ مثلاً میں نے پہلے بھی بارہا بیان کیا ہے کہ باپ کے سر پر جُوتی مارنا بہت بڑا گناہ ہے لیکن اگر کوئی شخص دیکھے کہ باپ کے سر پر سانپ چڑھ رہا ہے اور اُس کے پاس اُس وقت سوائے جوتی کے اور کوئی چیز موجود نہ ہو جو سانپ کو ماری جائے اور وہ جُوتی ہی اُٹھا کر باپ کے سر پر مار دے تو اس کا یہ فعل بُرا نہ ہوگا بلکہ اچھا ہوگا کیونکہ اگر وہ جُوتی نہ مارتا تو سانپ اس کے باپ کو ڈس لیتا اور وہ ہلاک ہو جاتا۔ اسی طرح ہمیں عربوں کی مہمان نوازی کے متعلق یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کن حالات کے ماتحت تھی آیا وہ کسی قسم کے طبعی یا اقتصادی فوائد کے پیش نظر تھی یا وہ خدا کے حکم کے ماتحت ایسا کرتے تھے اور وہ خدا کے بندوں کو مستحق سمجھ کر رزق کھلاتے تھے اور ان کے پیش نظر اعلیٰ درجہ کے مقاصد تھے۔ ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ وہ اس مہمان نوازی کے لئے مجبور تھے اور ان کے پیش نظر بنی نوع انسان کی خدمت ہرگز نہ تھی۔ اسی طرح اور بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جو بظاہر اچھی نظر آتی ہیں مگر درحقیقت وہ بُری ہوتی ہیں یا بظاہر بُری معلوم ہوتی ہیں مگر درحقیقت وہ اچھی ہوتی ہیں مگر یہ ایک لمبا مضمون ہے جو ایک دن میں ختم نہیں ہوسکتا اس لئے میں پھر کسی وقت اِس کے متعلق بیان کروں گا۔

۲۷ رمئی ۱۹۴۷ء

حضور نے فرمایا:۔

میں کل یہ بیان کر رہا تھا کہ جہاں تک بعض اچھے کاموں کا یا بظاہر اچھے نظر آنے والے کاموں کا سوال ہے عربوں کے اندر بعض خوبیاں ضرور پائی جاتی تھیں مثلاً میں یہ مضمون بیان کر رہا تھا کہ عربوں کے اندر اکرامِ ضیف کی صفت تھی یعنی وہ مہمان نوازی کرتے تھے اور یہ

صفت ان کے اندر انفرادی نہ تھی بلکہ قومی تھی ۔ میں نے کل کے مضمون میں بتایا تھا کہ منیر الحصنی صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بیان کیا تھا کہ بعض مناقب عربوں کے اندر پائے جاتے تھے اور معترض نے سوال کیا تھا کہ آیا وہ مناقب عربوں کے اندر شخصی تھے یا قومی اگر تو وہ شخصی تھے تو اس قسم کے مناقب ہر قوم میں پائے جاتے ہیں اور اگر وہ قومی تھے تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانہ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ اس پر حرف آتا ہے میں نے بتایا تھا کہ کسی اچھی یا بظاہر اچھی نظر آنے والی صفت کے متعلق یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ شخصی ہے یا قومی بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے پس پردہ اس شخص یا قوم کے اندر کون سے جذبات کام کر رہے ہیں ۔ مثلاً ہم دیکھیں گے کہ قرآن کریم نے جو نقطہ نگاہ کسی کام کی اچھائی یا بُرائی معلوم کرنے کے لئے پیش کیا ہے اس کے معیار کے مطابق وہ فعل اچھا ہے یا نہیں اگر نہیں تو اس فعل کا کسی قوم کے اندر پایا جانا اخلاقِ فاضلہ نہیں کہلا سکتا اس کا نام زیادہ سے زیادہ ہم فعلِ حسن رکھ سکتے ہیں اور فعلِ حسن کا پایا جانا جس کے پیچھے بعض اغراض کام کر رہی ہوں قرآن کریم اور اسلام کے دعویٰ کے خلاف نہیں ہوسکتا ۔ میں نے اکرامِ ضیف کی مثال دی تھی کہ یہ خوبی عربوں کے اندر عام پائی جاتی تھی اور اس کثرت کے ساتھ تھی کہ گویا یہ صفت ان کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھی اور وہ غیر ارادی طور پر اس کے لئے مجبور ہو چکے تھے ۔ لیکن میں نے بتایا تھا کہ فعلِ حسن اور اخلاقِ فاضلہ میں فرق کیا ہے کسی قوم کے اندر کسی ایسی صفت کا پایا جانا جس کے پیچھے ان کے سیاسی اغراض اور مفاد کام کر رہے ہوں فعلِ حسن تو کہلائے گا لیکن اخلاقِ فاضلہ نہیں کہلا سکتا ۔ عربوں کا یہ فعل اس لئے نہ تھا کہ وہ خلقِ خدا کی خدمت کرتے تھے بلکہ وہ اپنے مخصوص حالات کے ماتحت اپنے اقتصادی فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے مجبور تھے کہ وہ مہمان نوازی کرتے ۔ عرب لوگ چونکہ خانہ بدوش تھے اور خانہ بدوشوں کے پاس ہوٹل اور ریسٹورنٹ تو ہوتے نہیں کہ اگر سفر درپیش ہو تو ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں قیام کر لیا جائے ان کی تو یہ حالت تھی کہ آج یہاں اور کل وہاں ایسے علاقہ میں جب سفر کرنا پڑ جائے تو سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ کسی قبیلہ کے پاس قیام کیا جائے اور جب کسی قبیلہ کے پاس قیام کیا جائے گا تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ اپنے مہمانوں

کے لئے سامان خورد ونوش مہیا کرے۔ ایسے علاقہ کے لوگ اگر مہمان نوازی نہیں کریں گے تو ان کے لئے بھی سفر کرنا مشکل ہو جائے گا۔فرض کرو ایک قبیلہ یا خاندان کے الف ب، ج د، ہ و افراد سَو میل کے اندر پھیلے ہوئے ہیں ان کو کبھی نہ کبھی سفر ضرور کرنا پڑے گا۔کسی کا بیٹا کہیں بیاہا ہوگا اور وہ اس کو ملنے جائے گا، کوئی تجارت کے لئے سفر کرے گا، کوئی سیر کی غرض سے سفر اختیار کرے گا اور کوئی کسی اور غرض کے ماتحت۔ یہی حالت عربوں کی تھی وہ جب ایسے سفر کے لئے نکلتے تھے تو ان کے ساتھ سامانِ خورونوش تو ہوتا نہیں تھا اور نہ ہی کسی جگہ ہوٹل یا ریسٹورنٹ ہوتے تھے کہ ان میں قیام کر لیا جائے ایسی صورت میں یہی ہوسکتا تھا کہ جو قبیلہ رستہ میں آئے اس کے پاس ٹھہر جاتے اور وہ ان کے لئے سامانِ خورونوش مہیا کرتا، ان حالات میں اگر وہ قبیلہ کہہ دیتا کہ ہم کیوں کسی کو روٹی دیں یا بستر دیں تو کل کو اسے بھی سفر کرنا پڑتا اور تکلیف کا سامنا ہوتا۔پس جو مشکلات سفر کے لئے الف کو تھیں وہی ب کو بھی تھیں اسی طرح وہی مشکلات ج، د، ہ اور و کو بھی تھیں اگر الف اپنے مہمانوں کو کھانا کھلانے سے انکار کر دے مثلاً وہ ب کو کھانا نہ کھلائے تو اس سے صرف ب کو ہی تکلیف نہ ہوگی بلکہ کل کو الف کو بھی ہوگی پس ان حالات میں لازمی طور پر الف مجبور ہے کہ ب ج د ہ اور و کے آدمیوں کی مہمان نوازی کرے ب مجبور ہے الف ج د ہ اور و کے آدمیوں کی مہمان نوازی کرے ج مجبور ہے الف ب ہ اور و کے آدمیوں کی مہمان نوازی کرے اسی طرح د ہ اور و مجبور ہیں کہ وہ اپنے مہمانوں کی مہمان نوازی کریں۔اگر الف ب کی مہمان نوازی نہ کرے تو کل ب الف کی نہیں کرے گا پس ان کا یہ فعل فورسز آف ایوینٹس (Forces of Events) کی وجہ سے تھا ان کے حالات ہی اس قسم کے تھے کہ وہ اس فعل کے لئے مجبور تھے۔اگر وہ مہمان نوازی نہ کرتے تو ان کو سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا۔سامانِ خورد ونوش کوئی شخص اپنے ساتھ لے کر چلتا نہ تھا، ہوٹل اور ریسٹورنٹ ہوتے نہ تھے ایسی صورت میں اگر مہمان نوازی نہ کی جائے تو بہت زیادہ دِقّت پیش آتی ہے۔پس کسی قوم کا ایسے حالات کے ماتحت کوئی صفت اپنے اندر پیدا کرنا کہ وہ اس کے لئے مجبور ہو اُسے ہم جبری تو کہیں گے بِالا رادہ نہیں کہیں گے اور یہ فعلِ حسن تو کہلائے گا لیکن خُلقِ فاضل نہ ہوگا اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں کفار کے ایک قول کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے

يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ [۳] کہ یہ کس طرح کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں ڈھیر مال خرچ کیا ہے کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کو کسی نے نہیں دیکھا اس نے اگر مال خرچ کیا ہے اور مہمان نوازی کی ہے تو اپنے مفاد کے پیش نظر اور سیاسی اغراض کے ماتحت اس کو کیا حق ہے کہ ہمارے سامنے کہے کہ میں نے اتنا مال تقسیم کیا ہے اگر اس نے مال تقسیم کیا تو کیا کسی پر احسان کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر اس نے احسان کیا ہے تو اپنے اوپر نہ کہ کسی دوسرے کے اوپر جیسے ہمارے ملک میں اگر کوئی شخص کشمیر کی سیر کا ارادہ کرے اور اسے کوئی کشمیری مل جائے تو واقفیت پیدا کرنے کے لے کہہ دے گا آیئے بھائی صاحب یا اگر افغانستان جا رہا ہو اور کوئی پٹھان مل جائے تو کہے گا آیئے خان صاحب! لیکن اگر اس کا کشمیر یا افغانستان جانے کا ارادہ نہ ہو تو کشمیری یا پٹھان کا واقف بھی نہ بنے گا لیکن جب اسے ضرورت درپیش ہوگی تو وہ بھائی صاحب اور خان صاحب کہتا پھرے گا تا کہ اُسے سفر میں سہولت حاصل ہو اور ہمارے ملک میں تو سفر کی تکلیفیں بھی نہیں ہیں ریل کا سفر ہوتا ہے اور جگہ جگہ ہوٹل اور ریسٹورنٹ ہیں اگر کسی سے واقفیت نہ بھی ہو تو بھی سفر آسانی کے ساتھ طے ہو سکتا ہے مگر کوئی مجبوری نہ ہونے کی صورت میں بھی جب کوئی کشمیر وغیرہ سیر کے لئے جاتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ وہاں کے کسی آدمی سے واقفیت نکل آئے بلکہ یہاں تک کہ بعض لوگ تو یہاں سے کسی دوست کے ذریعہ چٹھیاں لے جاتے ہیں تا کہ منزلِ مقصود پر پہنچ کر کوئی تکلیف نہ ہو پس جہاں ان حالات میں کہ ہمارے ہاں سفر کرنے میں دشواریاں بھی نہیں ہیں یہ ضرورت پیش آ جاتی ہے کہ کسی کے ساتھ واقفیت پیدا کی جائے تو عرب کے لوگ جن کے نہ مکان تھے اور نہ ان کے پاس سامانِ خور و نوش ہوتا تھا ان کو تو بدرجہ اَولیٰ یہ ضرورت پیش آنی چاہئے تھی۔ ان کو تو پانی بھی آسانی کے ساتھ میسر نہ آتا تھا اور دور دور سے جا کر پانی لانا پڑتا تھا یہ حالات تھے جن کی وجہ سے وہ قدرتی طور پر مجبور تھے اس بات کے لئے کہ وہ مہمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور یہ ایک قومی لین دین تھا۔ آج الف۔ ب کے ہاں مہمان ہوتا تھا تو کل ب۔ الف کے ہاں اس لئے اگر ب الف کی مہمان نوازی میں پس و پیش کرتا تو خود اسے بھی تکلیف ہوتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا وہ کہتا ہے میں نے ڈھیروں ڈھیر مال خرچ کیا ہے

اَيَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ يَرَهٗۤ اَحَدٌ فرماتا ہے ہم یہ تو نہیں کہتے کہ تم نے مال خرچ نہیں کیا سوال تو یہ ہے کہ تم نے جو مال خرچ کیا ہے وہ کس نیت اور ارادہ کے ساتھ کیا ہے۔

دوسری مثال میں نے کل بھی بیان کی تھی کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی بار وحی کا نزول ہوا تو آپ گھبرائے ہوئے گھر پہنچے اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا لَـقَـدۡ خَشِيۡـتُ عَـلٰى نَفۡسِىۡ یعنی میں اپنے نفس کے متعلق ڈرتا ہوں کہ جو بوجھ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ڈالا ہے اس میں میرا نفس کہیں کمزوری نہ دکھا جائے اور میں اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ ذمہ داری کو ادا کرنے سے قاصر نہ رہ جاؤں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد نہ بن جاؤں۔ اس کے جواب میں حضرت خدیجہؓ نے منجملہ آپ کی اور صفات اور اخلاقِ فاضلہ بیان کرنے کے ایک خُلقِ فاضل یہ بھی بیان کیا کہ اِنَّکَ تَـقۡـرِى الضَّيۡفَ آپ مہمان نواز ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رُسوا نہیں کرے گا۔ حالانکہ حضرت خدیجہؓ جانتی تھیں کہ عربوں کے اندر مہمان نوازی پائی جاتی ہے لیکن پھر بھی کہا کہ كَلَّا اَبۡشِـرۡ فَـوَالـلّٰـهِ لَا يُـخۡـزِيۡكَ اللّٰهُ اَبَداً اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَصۡدُقُ الۡـحَـدِيۡثَ وَ تَحۡمِلُ الۡكَلَّ وَتَكۡسِبُ الۡمَعۡدُوۡمَ وَ تَقۡرِى الضَّيۡفَ یعنی خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا کیونکہ آپ کے اندر مہمان نوازی کی صفت پائی جاتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ اس بات کو سمجھتی تھیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہمان نوازی اور عربوں کی مہمان نوازی میں فرق ہے۔ مکہ والے اگر مہمان نوازی کرتے تھے تو وہ نذروں اور نیازوں کے لئے کرتے تھے اب بھی چلے جاؤ اور دیکھ لو وہ اس طرح مہمان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ انسان حیران ہو جاتا ہے۔ جب کوئی جاتا ہے تو اس کو کہتے ہیں آیئے ہمارے ہاں تشریف لایئے یہ آپ ہی کا مکان ہے اور ہمارے ہاں آپ کو ہر قسم کی سہولتیں میسر ہوں گی۔ ایک پنجابی تو ان کی باتوں سے یہ خیال کرے گا کہ یہ کہاں سے ہمارے رشتہ دار نکل آئے کہ اس طرح کھینچ کھینچ کر اپنے گھر لئے جاتے ہیں مگر وہ مہمان کو ساتھ لے جائیں گے اور کھانا وغیرہ کھلانے کے بعد کہیں گے میں مطوف ہوں لایئے میری فیس تب جا کر آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو اپنی فیس کے لئے ایسا کر رہے تھے ورنہ اس سے پہلے وہ یہی سمجھتا ہے کہ یہ میرے حقیقی رشتہ دار معلوم ہوتے ہیں۔ پُرانے زمانہ میں وہ خود نہ مانگتے تھے بلکہ لوگ ان کو نذریں اور

نیازیں دے جاتے تھے مگر اب چونکہ حالات بدل گئے ہیں اس لئے ان کو مانگنا پڑتا ہے۔ اُس زمانہ میں تو مکہ کے ایک حصہ کا گزارہ ہی نذروں اور نیازوں پر تھا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نذروں اور نیازوں سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کے سفر کرتے تھے کہ آپ کو مجبوراً مہمان نوازی کرنی پڑتی، نہ ہی آپ کو کسی کے ساتھ کوئی سیاسی یا اقتصادی غرض تھی۔ ادھر مکہ والوں کی مہمان نوازی اس غرض کے ماتحت ہوتی تھی کہ اب ہم مہمان نوازی کرتے ہیں جب ہم ان کے پاس جائیں گے تو یہ ہماری مہمان نوازی کریں گے۔ مگر آپ نے تو اس قسم کا سفر ہی کبھی نہ کیا تھا آپ تو غار حرا میں عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے آپ کا تعلق نہ نذر و نیاز سے تھا نہ کسی اور غرض کے ساتھ پس آپ کی مہمان نوازی اور مکہ والوں کی مہمان نوازی میں نمایاں فرق تھا۔ آپ کا یہ فعل صرف خدا تعالیٰ کے لئے تھا اور مکہ والوں کا یا دوسرے عربوں کا یہ فعل اپنے نفس کے لئے اور اپنے حالات سے پیدا شدہ مجبوری کے ماتحت تھا۔ پس اس طرح کسی کو کھانا کھلانا یا مہمان نوازی کرنا کہ کل جب میں اس کے پاس جاؤں گا تو یہ میری مہمان نوازی کرے گا اس کو فعل حسن تو کہا جا سکتا ہے خُلقِ فاضل نہیں کہا جا سکتا خلق فاضل وہ ہے جس میں اپنے نفس کا خیال نہ ہو بلکہ وہ فعل صرف خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کیا جا رہا ہو۔ پس عربوں کی مہمان نوازی Forces of Events کی وجہ سے تھی ورنہ ان کے مدنظر خدمت خلق یا خدا تعالیٰ کی خوشنودی نہ تھی وہ اپنے حالات گرد و پیش سے ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ خانہ بدوش قومیں جن میں شہریت نہیں ہوتی لازمی طور پر مہمان نوازی کے لئے مجبور ہوتی ہیں اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کے حالات تباہ ہو جائیں۔ عرب لوگ جہاں مہمان نواز ہیں وہاں اگر کوئی شخص ان کے منشاء کے خلاف کچھ کر گزرے تو سخت گیر بھی ہوتے ہیں۔ حضرت خلیفہ اوّل ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ کوئی ہندوستانی حج کرنے جا رہا تھا کہ راستہ میں ایسی حالت میں کہ اس کے پاس نہ پیسہ تھا اور نہ سامانِ خورونوش اپنے قافلہ سے بچھڑ گیا وہ اِدھر اُدھر کھانے کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ اسے ایک عرب کی جھونپڑی نظر آئی وہ اس طرف چلا گیا اور کہا میں بھوک سے نڈھال ہو رہا ہوں اور میرے پاس پیسے بھی نہیں ہیں مجھے کھانا دو وہ عرب غریب آدمی تھا اس کے پاس اور تو کچھ نہ تھا، عرب کے جنگلوں اور صحراؤں میں ایسا ہوتا

ہے کہ پانی کی دھاریں زمین کے نیچے بہتی ہیں اور کہیں کہیں زمین کے اوپر آ جاتی ہیں اور پھر غائب ہو جاتی ہیں اسی طرح اس عرب کی جھونپڑی کے پاس پانی کی دھار زمین کے اوپر تھی اور اس نے کنال دو کنال ٹکڑے میں تربوز بوئے ہوئے تھے، عرب نے اس میں سے تربوز توڑ کر مہمان کو دینے شروع کئے جو کچا تربوز ہوتا وہ پھینک دیتا اور جو پکا ہوتا وہ مہمان کو دے دیتا۔ جب مہمان کا پیٹ بھر گیا تو عرب تلوار لے کر اس کے سر پر کھڑا ہو گیا اور کہا کھڑے ہو جاؤ وہ ہندوستانی بیان کرتا تھا کہ میں عرب کے اس فعل سے سخت متعجب ہوا کہ پہلے تو اس نے مجھے تربوز توڑ توڑ کر کھلائے اور اب یہ تلوار سونت کر میرے سر پر آن کھڑا ہوا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی نے پوچھا کیا بات ہے؟ عرب نے کہا بات کیا ہے کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کھڑا ہوا تو عرب نے اس کی اچھی طرح سے تلاشی لی اور یہ دیکھ کر کہ اس کے پاس سے کچھ نہیں نکلا چھوڑ دیا اور کہنے لگا میں نے تمہاری مہمان نوازی کے لئے اپنا سارا کھیت تباہ کر دیا تھا مگر میں نے مہمان نوازی کا حق تو ادا کر دیا اب میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم نے جو کہا تھا کہ میرے پاس کچھ نہیں آیا تم نے یہ سچ کہا یا جھوٹ؟ اگر تمہارے پاس سے کچھ نکل آتا تو میں تمہیں ضرور مار دیتا کیونکہ یہی ایک کھیت تھا جس پر میرا اور میرے بیوی بچوں کا گزارہ تھا اور یہ میں نے تمہاری مہمان نوازی کے لئے تباہ کر دیا گویا میں نے اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو اور اپنے بیوی بچوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ اسی طرح وزیرستان وغیرہ کے پٹھان سڑک پر سے گزرتے ہوئے لوگوں کو مار دیتے ہیں اور ان کے مال چھین کر لے جاتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص سڑک سے ہٹ کر ان کے گھر میں پہنچ جائے تو وہ اس کی بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں اور مہمان نوازی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ یہ مہمان نوازی تو ہے لیکن مہمان نوازی کی غرض کیا ہے؟ اگر ان کی یہ مہمان نوازی خدا کے لئے ہو تو سڑک پر جانے والوں کے لئے بھی ہو۔ مگر نہیں سڑک پر جانے والوں کے وہ کپڑے بھی اُتار لیتے ہیں۔ پس یہ فرق ہے فعلِ حسن اور خُلقِ فاضل میں۔ اسلام جب کہتا ہے کہ عربوں کے اندر کوئی خوبی نہ تھی تو وہ اس نقطۂ نگاہ سے کہتا ہے کہ ان کے اس قسم کے افعال اخلاقِ فاضلہ نہ تھے یہ الگ بات ہے کہ کوئی شخص کہہ دے کہ اسلام کا نقطۂ نگاہ غلط ہے۔ ایسی صورت میں اس بات پر بحث ہوگی کہ یہ نقطۂ نگاہ غلط ہے یا صحیح لیکن اسلام کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ جو فعل اپنی اغراض کے پیش نظر سیاسی یا

اقتصادی مفاد کیلئے کیا جائے اور وہ بظاہر حسین نظر آتا ہو تو وہ فعلِ حسن تو ضرور کہلائے گا لیکن اخلاقِ فاضلہ نہیں کہلا سکتا۔ پس عربوں کے اندر مہمان نوازی کا پایا جانا خدا کے لئے یا خلقِ خدا کی خدمت کیلئے نہ تھا بلکہ وہ ان کے مخصوص حالات کے ماتحت تھا اور وہ اس کے لئے مجبور تھے۔ بے شک ان کا یہ فعل خوبصورت نظر آتا ہے اور ہے بھی خوبصورت لیکن اس کے اندر نیکی کا پہلو نہیں ہے اسی طرح عربوں کے اندر پناہ دینے کا رواج تھا مگر وہ بھی کسی دباؤ کے ماتحت اور مختلف اغراض کو اپنے اندر لئے ہوئے تھا۔ ہمارے ملک کے اندر جنگلات پائے جاتے ہیں چور یا ڈاکو پناہ لینے کے لئے اور پولیس کی نظروں سے بچنے کے لئے جنگلات میں چلے جاتے ہیں یا بڑے بڑے شہروں میں چھپ جاتے ہیں جہاں کئی کئی ماہ تک پولیس ان کا سراغ لگاتی رہے تو بھی ناکام رہتی ہے لیکن عرب کی یہ حالت تھی کہ ہر قبیلہ الگ الگ رہتا تھا۔ ہمارے ملک میں تو یہ حالت ہے کہ جس بڑے شہر میں چلے جاؤ وہاں یہی نظر آئے گا کہ ایک گھر گجرات کے کسی شخص کا ہے، دوسرا سیالکوٹ سے آکر رہ رہا ہے، تیسرا مدراس کا آدمی بسلسلہ ملازمت رہتا ہے، چوتھا بمبئی کا آدمی تجارت کی غرض سے آیا ہوا ہے، پانچوں کلکتہ کا ہے گویا ہمارے شہروں کی آبادی اس طرح مخلوط ہوتی ہے کہ اگر کوئی اجنبی کسی کے پاس آکر ٹھہر جائے تو پتہ ہی نہیں لگ سکتا۔ لیکن عربوں کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی وہ قبیلہ وار رہتے تھے اور جب کوئی غیر شخص آجاتا تھا تو وہ کہتے تھے یہ غیر ہے ان لوگوں میں چونکہ لوٹ مار اور جھگڑے ہوتے رہتے تھے اس لئے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ جب کوئی جُرم کر کے کسی کے پاس پہنچ جائے تو وہ اسے پناہ دے تا کہ کل کو ہم اس کے ہاں پناہ لے سکیں۔

عرب کی لڑائیاں تو مشہور ہیں اور معمولی معمولی باتوں پر قبائل آپس میں اُلجھ جاتے تھے اور کئی کئی سال تک آپس میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں اسی طرح عرب کی ایک مشہور جنگ جو عرصۂ دراز تک جاری رہی اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ کسی شخص کے کھیت میں ایک کتیا نے بچے دیئے اور کسی دوسرے کی اونٹنی چرتے چراتے اِدھر سے گزری اور اس کے پاؤں کے نیچے آکر کتیا کا ایک بچہ مارا گیا۔ کھیت والے نے یہ سمجھ کر کہ یہ کتیا میری پناہ میں تھی جھٹ اونٹنی پر حملہ کر کے اس کی کونچیں کاٹ دیں۔ اونٹنی کے مالک نے جب دیکھا کہ میری اونٹنی کو مارا گیا ہے تو اس

نے جا کر اُس مارنے والے کو قتل کر دیا اِس پر طرفین کے قبیلے آ گئے اور جنگ شروع ہو گئی اور تاریخوں میں آتا ہے کہ وہ جنگ تیس سال تک جاری رہی۔ اب یہ بھی کوئی عقل کی بات تھی کہ کتیا کا بچہ اونٹنی کے پاؤں کے نیچے آ کر مر جانے سے تیس سال تک جنگ لڑی جاتی۔ یہ پناہ دینے کا انتہائی جذبہ تھا جو ان لوگوں میں پایا جاتا تھا مگر دیکھنا تو یہ ہے کہ اس بات کا محرک کیا تھا۔ اس بات کا محرک خدا تعالیٰ کی خوشنودی نہ تھی، دین کی پیروی نہ تھی، اگلے جہان کی بہبودی مدنظر نہ تھی، کوئی نیکی کرنا مقصود نہ تھا اس کی محرک صرف قبائلی زندگی اور ان کا رسم ورواج تھا اور وہ صرف ایسے کاموں سے اپنی عزت بڑھانا چاہتے تھے اور یہ دکھانا مقصود تھا کہ ہم اتنے بہادر ہیں۔

ہمیں ان کے اس رواج میں بعض خوبصورت کام بھی نظر آتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سے ایک دفعہ فائدہ اُٹھایا تھا۔ آپ جب سفر طائف سے واپس تشریف لائے تو چونکہ عرب دستور کے مطابق مکہ چھوڑ دینے کے بعد اب آپ مکہ کے باشندے نہیں تھے بلکہ اب مکہ والوں کا اختیار تھا کہ وہ آپ کو مکہ میں آنے دیں یا نہ آنے دیں اس لئے آپ نے مکہ کے ایک رئیس مطعم بن عدی کو کہلا بھیجا کہ میں مکہ میں داخل ہونا چاہتا ہوں کیا تم عرب دستور کے مطابق مجھے داخلہ کی اجازت دیتے ہو۔ مطعم بن عدی اسلام کا سخت دشمن تھا لیکن ایسے حالات میں انکار کرنا بھی بہادر عربوں کی شان اور شرافت کے خلاف تھا اس لئے جب یہ پیغام اس کے پاس پہنچا اور پیغامبر نے اسے کہا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیغام تمہاری طرف بھیجا ہے تو وہ اُسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا جب محمد (ﷺ) نے کہا ہے تو میرا فرض ہے کہ میں اُن کو پناہ دوں یہ کہہ کر اس نے اپنے پانچوں بیٹوں کو بلایا اور کہا آج میری اور میرے خاندان کی عزت کا سوال ہے تم اپنی اپنی تلواریں نکال لو کیونکہ ہم نے محمد (ﷺ) کو اپنی پناہ میں لے کر شہر میں داخل کرنا ہے اور یاد رکھو کہ تم خود ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ مگر محمد (ﷺ) کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ وہ خود اور اس کے پانچوں بیٹے تلواریں ننگی کر کے گئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حفاظت میں مکہ میں داخل کیا اور آپ نے اسی حالت میں کعبہ کا طواف بھی کیا[8] اس کے بعد وہ لوگ آپ کو گھر پہنچا کر واپس چلے گئے اور پھر آپ کی

مخالفت میں سرگرم ہو گئے۔ پس یہ خوبی تو عربوں کے اندر تھی مگر عزتِ نفس کے لئے تھی خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے نہ تھی مگر اسلام دنیا میں اخلاقِ فاضلہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کہتا ہے میں تمہیں اس لئے اچھے کاموں کا حکم دیتا ہوں کہ تم نیک ہو جاؤ اسلام کہتا ہے میں تمہیں اس لئے اچھے کاموں کا حکم دیتا ہوں تا تمہاری روحانیت بلند ہو جائے اور اسلام کہتا ہے میں تمہیں اس لئے اچھے کاموں کا حکم دیتا ہوں کہ تم اخلاقِ فاضلہ کے حامل ہو جاؤ۔ مگر عربوں میں یہ بات نہ تھی وہ اس لئے مہمان نوازی کرتے تھے کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ وہ اس لئے پناہ دیتے تھے کہ ہم معزز قرار پائیں پھر عربوں کے اندر بعض برائیاں بھی پائی جاتی تھیں اور میں نے اپنی بعض کتابوں میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ عربوں میں اپنی لڑکیاں مار دینے کا رواج تھا اور قرآن کریم میں بھی اس بات کا ذکر آتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سارے عربوں میں یہ رواج تھا اگر سب میں یہ رواج ہوتا تو نسل کیسے چلتی اور بچے کس طرح پیدا ہوتے اور وہ شادیاں کس طرح کرتے، اگر سارے ہی اپنی لڑکیوں کو مار دیتے تو کچھ عرصہ کے بعد یقیناً ان کی نسل ختم ہو جاتی۔ پس سارے عربوں میں یہ رواج نہ تھا بلکہ صرف دو تین قبیلوں میں یہ بات پائی جاتی تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے تھے اور اس کا محرک یہ امر ہوتا تھا کہ ہم اتنے بڑے آدمی ہیں یا اتنی وجاہت رکھتے ہیں کہ ہم اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے ہم کسی ایسے شخص کو رشتہ دیں جو ہم سے کم وجاہت رکھتا ہو۔ یہ جذبہ تھا جس کے ماتحت وہ بیٹیوں کو قتل کر دیتے تھے اور یہ کام صرف وہی لوگ کرتے تھے جو اپنے آپ کو بہت بڑا امیر کبیر یا خاندانی لحاظ سے رُعب اور دبدبے والا یا اثر ورسوخ کے لحاظ سے بڑا آدمی یا سیاست اور تدبیر کے لحاظ سے سیاستدان اور مدبّر سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ کسی کا ہماری بیٹیوں کا خاوند بننا ہماری ہتک ہے۔ مگر وہ رواج ان میں شاذ تھا عام نہ تھا اور جب یہ شاذ تھا تو ساری قوم کی طرف یہ فعل کس طرح منسوب ہو سکتا ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ باقی عرب جو یہ فعل نہیں کرتے تھے وہ ان کے اس فعل کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے اگر باقی عرب یہ کہتے کہ یہ فعل بُرا ہے تو واقعی ساری قوم کی طرف یہ بات منسوب نہیں ہو سکتی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو عرب اس پر عامل نہ تھے وہ بھی دوسروں کے اس فعل کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور وہ بُرا نہیں مناتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ یہ بہت اچھا فعل ہے

اس لئے چاہے وہ خود نہ کرتے تھے مگر ان کی پسندیدگی کی وجہ سے یہ فعل ساری قوم کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ جیسے کسی قوم کا کوئی ایک شخص چوری کر کے واپس پہنچے اور ساری قوم اس کو شاباش کہے تو گو شاباش کہنے والوں نے خود چوری نہ کی ہوگی مگر شاباش کہنے کی وجہ سے اور چوری کے فعل پر پسندیدگی کا اظہار کرنے کی وجہ سے وہ سب چور کہلائیں گے۔ اسی طرح یہ عیب عربوں میں شاذ تو تھا لیکن اس پر عامل نہ ہونے والوں کی پسندیدگی کی وجہ سے یہ فعل ساری قوم کی طرف منسوب ہوگا۔ پس عربوں میں بعض مناقب بے شک پائے جاتے تھے گو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس لفظ کے لغۃً کیا معنے ہیں اور عربی زبان میں اسے کن معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے جہاں تک مَیں سمجھتا ہوں نقب کے معنی ہوتے ہیں گہرا چلا جانا اور مناقب کے معنے ہیں ایسی رسوم جو کسی قوم کے اندر گھر کر جائیں اور ان کی روزمرہ زندگی کا جزو بن جائیں۔ بہرحال اگر تو مناقب کے معنی افعالِ حسنہ کے ہیں تو افعالِ حسنہ عربوں کے اندر ضرور پائے جاتے تھے لیکن قرآن کریم کے نقطۂ نگاہ سے جن اَفعال کو اخلاقِ فاضلہ کہا گیا ہے وہ ان میں نہ تھے جیسے قرآن کریم میں آتا ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ یہودی تھے اور عیسائی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم عیسائی تھے لیکن جب حضرت ابراہیم یہودیوں اور عیسائیوں کے پیدا ہونے سے بھی بہت پہلے تھے تو وہ یہودی یا عیسائی کس طرح ہو سکتے تھے، یہ قومیں تو آپ کی وفات کے ایک لمبا عرصہ بعد پیدا ہوئیں۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوگی جیسے آج کوئی شخص کہہ دے کہ میرے پڑدادا نے آج سے ایک ہزار سال پہلے ریل بنائی تھی یہ سُن کر ہر شخص اس کی بیوقوفی پر ہنس دے گا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم تو یہودیت سے پانچ چھ سَو سال پہلے اور نصرانیت سے قریباً بیس سَو سال پہلے تھے پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ آپ یہودی تھے یا نصرانی تھے ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم اخلاقِ فاضلہ کی وہ تعریف کرتا ہے جو تعریف اس سے پہلے کسی مذہب نے نہیں کی اور جب اخلاقِ فاضلہ کی صحیح تعریف سب سے پہلے اسلام نے ہی پیش کی ہے تو عربوں میں اسلام سے قبل اخلاقِ فاضلہ پیدا ہی کس طرح ہو سکتے تھے۔ پس جہاں تک قرآن کی تعریف کا سوال ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عربوں کے اندر کوئی مناقب نہ تھے لیکن اگر مناقب کے معنی افعالِ حسنہ کیلئے جائیں تو یہ عربوں میں ضرور پائے جاتے تھے اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اسلام لانے سے پیشتر سَو اونٹ ذبح کر کے غریبوں کو کھلائے تھے آپ نے فرمایا تمہاری اسی نیکی کی وجہ سے تمہیں ہدایت نصیب ہوئی ہے[9] پس جو فعل اچھا ہواُسے اچھا ہی کہنا پڑے گا۔

حاتم طائی گو مسلمان نہ تھا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی سخاوت کی وجہ سے اس کا اتنا خیال تھا کہ جب ایک دفعہ قیدی آئے تو ان میں ایک عورت بھی تھی اس عورت کے متعلق جب معلوم ہوا کہ وہ حاتم طائی کی بیٹی ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے شرم آتی ہے کہ جو شخص غیروں کے ساتھ اتنا حُسن سلوک کرتا تھا اس کی بیٹی کو قید رکھوں یہ کہہ کر آپ نے اسے آزاد کر دیا۔ حاتم طائی کی بیٹی بھی آپ کی صداقت اور شرافت کی قائل ہو چکی تھے اس نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ ! مجھے بھی شرم آتی ہے کہ میرے باقی ساتھی قید رہیں اور میں رہا ہو جاؤں۔ یہ سُن کر آپ نے باقی قیدیوں کو بھی رہا کرنے کا حکم دے دیا۔[10] پس حاتم طائی کی نیکی ہی تھی جس کی وجہ سے آپ نے اس کی لڑکی اور اس کی قوم کو رہا کر دیا۔ حکیم بن حزام کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوستی تھی گو ابتداء میں وہ آپ پر ایمان نہ لایا تھا مگر آپ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ حکیم بن حزام جیسا غریبوں سے ہمدردی کرنے والا میں نے نہیں دیکھا۔ آپ کے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے جانے کے بعد وہ ایک دفعہ تجارت کے لئے شام کی طرف گیا تو وہاں اس نے ایک نہایت خوبصورت جبّہ دیکھا، اُسے چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی اور آپ کا اس کے دل میں بڑا احترام تھا اس لئے باوجود کافر ہونے کے اور باوجود کفار کا سردار ہونے کے اس نے وہ جُبّہ آپ کے لئے خرید لیا اور واپس مکہ پہنچا اور پھر مکہ سے اونٹ پر سوار ہو کر آپ کے پاس مدینہ پہنچا اور وہ جُبّہ آپ کی خدمت میں پیش کر کے کہا کہ میں نے جب یہ جُبّہ دیکھا اور مجھے خوبصورت معلوم ہوا تو میں نے سمجھا کہ یہ جُبّہ میرے دوست محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی کو نہیں سجے گا۔ مگر آپ نے فرمایا میں کسی مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کر سکتا۔ وہ کہنے لگا میں نے آپ کو یہ جُبّہ پہنچانے کے لئے کتنا لمبا سفر اختیار کیا ہے اور میرے یہاں آنے کی سوائے اس کے اور کوئی غرض نہ تھی کہ میں آپ کو یہ جُبّہ پہنچاؤں جو مجھے

نہایت خوبصورت نظر آیا تھا۔ آپ نے فرمایا اچھا اگر تم یہ جُبّہ مجھے دینا ہی چاہتے ہو تو مجھ سے اس کی قیمت لے لو۔ اس نے کہا میں لایا تو آپ کو مفت دینے کے لئے تھا لیکن اگر آپ مفت نہیں لینا چاہتے اور قیمت ادا کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔ چنانچہ آپ نے قیمت دے کر وہ جُبّہ اُس سے لے لیا۔[11] حکیم بن حزام کی یہ کتنی دوست پروری تھی کہ وہ شام سے ایک تحفہ آپ کے لئے لایا پہلے مکہ پہنچا اور پھر مکہ سے صرف اس غرض کے ماتحت کہ وہ جُبّہ آپ تک پہنچائے اس نے تین سَو میل کا سفر طے کیا صرف اس وجہ سے کہ یہ جُبّہ میرے دوست محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی سجے گا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس فعل کے پیچھے کونسا جذبہ کارفرما تھا۔ اس کے پیچھے یہ جذبہ تھا کہ وہ خدا کے ایک بندے کی خدمت کرنا چاہتا تھا تو یہ بڑے اعلیٰ درجہ کا خُلق ہے لیکن اگر اس کے پیچھے یہ جذبہ تھا کہ میں معزز کہلاؤں تو یہ فعل حسنہ تھا اخلاقِ فاضلہ اس کا نام نہیں رکھ جا سکتا۔

قرآن کریم کہتا ہے خُلقِ فاضل صرف وہی فعل ہو سکتا ہے جس کے پیچھے کوئی طبعی جذبہ نہ ہو، کوئی سیاسی غرض نہ ہو، کوئی اقتصادی مفاد مدنظر نہ ہوں بلکہ صرف خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کوئی کام کیا جائے۔ ایک ماں جب اپنے بچے سے محبت کرتی ہے تو وہ طبعی جذبہ کے ماتحت کرتی ہے اور اپنے بچے سے محبت کرنے کے لئے مجبور ہوتی ہے وہ جب بیمار ہوتا ہے اور اس کا دودھ نہیں پیتا تو وہ ڈاکٹروں، حکیموں اور ویدوں کے پاس ماری ماری پھرتی ہے کہ میرا بچہ کیوں میرا خون نہیں چوستا اور کہتی ہے خدا کے لئے اس کا علاج کرو۔ کیا ہم اس کو اخلاقِ فاضلہ کا نام دے سکتے ہیں ہرگز نہیں وہ عورت مجبور ہوتی ہے اپنی محبت کی وجہ سے اسی لئے وہ چاہتی ہے کہ وہ اس کا خون چوستا رہے۔ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ اخلاقِ فاضلہ اختیار کرنے سے آخر انسان اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ اخلاق اس کے طبعی جذبات کی طرح ہو جاتے ہیں اور وہ اخلاق فاضلہ پر بالکل اسی طرح مجبور ہو جاتا ہے جیسے ماں اپنے بچے کو دودھ دینے کے لئے۔ اور مؤمن کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر اس کے اخلاق فاضلہ کے رستہ میں کوئی رُکاوٹ واقع ہو جائے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے جو شخص اس حالت کو پہنچ جائے کہ اخلاق فاضلہ اس کے طبعی جذبات کے ماتحت عمل میں آنے لگ جائیں تو باوجود طبعی ہونے کے اس کی نیکی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُس وقت یہ کہا جائے گا کہ یہ شخص مجسم اخلاق بن گیا ہے۔ غرض عربوں کے اندر اس

قسم کے افعالِ حسنہ کا پایا جانا طبعی جذبات تھے جن کے پیچھے نیکی کا جذبہ نہ تھا بلکہ وہ عزتِ نفس کے لئے ایسا کرتے تھے اور اپنے گردو پیش کے حالات سے مجبور تھے کہ وہ ایسا کریں اور اس قوم کے بعض افراد یا بعض قبائل میں جو عیوب پائے جاتے تھے ان میں نہ کرنے والے بھی شریک تھے کیونکہ وہ ان کے عیوب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ ان کی تعریف کرتے تھے۔ بے شک بعض لوگ خود عفت پسند بھی ہوتے تھے مگر جب ایک شاعر کسی مجلس میں کھڑے ہو کر اپنے شعر سناتا تھا جن میں اس نے یہ بیان کیا ہوتا تھا کہ میں نے فلاں کی عورت کو اغوا کر لیا یا فلاں عورت کے ساتھ میں نے یہ کیا تو چاہے مجلس میں ایک شخص خود عفیف ہوتا تھا وہ شاعر کے فعل کو کھیل سمجھتا تھا اور اس پر حیرت اور استعجاب کا اظہار نہ کرتا تھا بلکہ سن کر مسکرا دیتا تھا۔ اس طرح گو وہ خود ایسے فعل کا ارتکاب نہ کرتا تھا مگر پسندیدگی کا اظہار کر کے وہ بھی ایسا کرنے والے کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا۔

سید منیر الحصنی صاحب نے جو آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کی ہے کہ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ [۱۲] مفسرین نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ آپ کے آباؤ اجداد نیک تھے حالانکہ ایک مشرک کو ہم عفیف تو کہہ سکتے ہیں لیکن اسے ساجد نہیں کہہ سکتے۔ یوں تو زبان کے لحاظ سے ہم بتوں کو سجدہ کرنے والوں کو بھی ساجد کہہ سکتے ہیں لیکن قرآن کریم میں جہاں کہیں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس معنوں میں ہوا ہے کہ موحد، ساجد اور راکع یعنی خدا کو سجدہ کرنے والے۔ پس اس آیت میں ساجدین کے یہ معنی نہیں کہ ہم نے تجھے موحد ساجدین میں سے گزارا اگر یہ معنی کئے جائیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد خدا رسیدہ تھے تو یہ صحیح نہیں تاریخ اس کے خلاف ہے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے والدین مشرک تھے اور ابو طالب جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ محبت تھی جب وہ مرنے لگے تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ بھتیجے! تیری باتیں تو سچی معلوم ہوتی ہیں لیکن بات یہ ہے کہ میں اپنی قوم کو نہیں چھوڑ سکتا۔ پس ایک طرف ساجد کے معنی موحد کے اور دوسری طرف تواریخ اور احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے دادا پڑدادا موحد نہیں تھے اس لئے وہ معنی جو مفسرین کی طرف سے کئے جاتے ہیں صحیح نہیں۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے

وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ میں یہ فرمایا ہے کہ اے محمد (ﷺ) تیرے گرد و پیش سب موحد ہی موحد ہیں اور تُو موحدین میں پھرتا ہے اور یہ ہمارا کتنا بڑا احسان ہے کہ مکہ جیسی شرک کی سرزمین میں ہم نے موحد ہی موحد پیدا کر دیئے ہیں اور ان لوگوں کو توحید پر عامل کر دیا ہے جو ایک نہیں دو نہیں سینکڑوں بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ تُو دائیں جاتا ہے تو تجھے موحد نظر آتے ہیں، تُو بائیں جاتا ہے تو تجھے موحد ملتے ہیں، تُو اِدھر جاتا ہے تو تجھے موحد ملتے ہیں اور تو اُدھر جاتا ہے تو تجھے موحد ملتے ہیں۔ غرض تُو جس طرف بھی جاتا ہے تجھے موحد نظر آتے ہیں اور مکہ جیسی شرک کی بستی میں ہم نے تیرے ساتھ موحدین پیدا کر دیئے ہیں۔ تَقَلُّب کے معنی ہیں اِدھر جانا اور اُدھر جانا۔ آپ جب خود اپنے والدین کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ مشرک تھے اور گو وہ رواجاً شرک کرتے تھے مگر کرتے ضرور تھے پھر یہ کہنا کہ آپ کے والدین موحد تھے یہ ایک ایسی بات ہے جس کے متعلق کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی نہیں ملتی نہ قرآن کریم سے نہ حدیثوں سے اور نہ تاریخ سے۔ پس تَقَلُّب کا مفہوم یہ نہیں تھا جو عوام نے سمجھ لیا ہے بلکہ یہ لفظ صحابہؓ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بعض انبیاء کی بیویاں ان پر ایمان نہ لائی تھیں، بعض کی اولاد نے ان کی نبوت کا انکار کر دیا تھا۔ حضرت لوطؑ کی بیوی آخر تک ایمان نہ لائی تھی گو بیویوں یا اولاد کے انکار سے نبی کی شان میں تو فرق نہیں آتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں تھیں تو خدا تعالیٰ کے دین پر فدا، آپ کی اولاد تھی تو وہ دین پر قربان، آپ کے ساتھی تھے تو وہ اسلام کے سچے عاشق، یہاں تک کہ سب تعلق والوں کو اللہ تعالیٰ نے ساجد بنا دیا اور یہ ایسی بات ہے کہ اور کسی نبی کو نصیب نہیں ہوئی۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تُو جہاں کہیں جاتا ہے موحدین اور ساجدین میں پھرتا ہے، تیرے گھر میں توحید، تیرے دوستوں میں توحید اور تُو جدھر جاتا ہے توحید کا بیج بویا جاتا ہے اور تُو نے ہزاروں مشرکین کو ساجدین بنا دیا ہے۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ایک نیکی ہوتی ہے بِالفعل اور ایک بِالقوۃ۔ جہاں تک قابلیت اور ترقی کا سوال ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل بِالفعل ان میں کوئی قابلیت اور ترقی نہیں تھی مگر جہاں تک بالقوۃ قابلیت اور ترقی کا سوال ہے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے

کہ اہل عرب میں یہ قابلیت اور ترقی پائی جاتی تھی بلکہ اس حد تک پائی جاتی تھی کہ دنیا کی کوئی قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی تدبیر کے عین مطابق ہے اللہ تعالیٰ خود قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ [۱۳] پس اللہ تعالیٰ بھی تدبیریں کرتا ہے جو اس کی حکمت پر مبنی ہوتی ہیں اور یہ بھی اس کی تدبیر ہی تھی کہ اس نے اپنا پیغام دنیا تک پہنچانے کے لئے عربوں میں اتنی قابلیت رکھ دی تھی کہ وہ اس بوجھ کو اُٹھا سکتے۔ ایک عقلمند انسان کسی بچہ پر اتنا بوجھ نہیں ڈالتا جو اُس کی طاقت سے بالا ہو پھر یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے انسان پر اپنا پیغام پہنچانے کا بوجھ ڈال دے جو اس کام کی اہلیت نہ رکھتا ہو یا وہ اپنے نبی کو کسی ایسی قوم میں بھیج دے جس میں ترقی کی قابلیت بالقوہ بھی نہ پائی جاتی ہو۔ بے شک عربوں کے اندر اخلاق فاضلہ نہ تھے لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں افعال حسنہ ضرور تھے جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ عربوں کے اندر اتنی قابلیت تھی یا نہ تھی کہ وہ اعلیٰ ترقیات کو حاصل کر سکیں ہم کہیں گے کہ اگر ان میں اعلیٰ قابلیت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قوم کے اندر کیوں بھیجتا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے اس مقام پر کھڑا کیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہترین انسان تھے جو اس عظیم الشان بوجھ کو اُٹھا سکتے اور عربوں کو اس لئے چنا کہ عرب ہی دنیا میں وہ بہترین قوم تھے جو اعلیٰ ترقیات حاصل کر سکتے تھے۔ بے شک ابوبکرؓ اسلام سے پیشتر صرف ابوبکر تھے لیکن ان کے اندر بِالقوۃ نیکی موجود تھی اللہ تعالیٰ نے عربوں کو چُنا ہی اس لئے تھا کہ ان میں قابلیت پائی جاتی تھی۔

کسی کا یہ کہنا کہ عرب اسلام سے پیشتر اسلام کی تعلیم پر کیوں نہ عمل کرتے تھے یہ محض حماقت ہوگی۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ قابل تو رومی بھی تھے، ایرانی بھی تھے یا ہندوستانی بھی تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر رومی قابل ہوتے تو اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اندر بھیجتا، اگر ایرانی قابل ہوتے تو اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اندر مبعوث فرماتا، اگر ہندوستانی قابل ہوتے تو اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اندر بھیجتا اور اگر افریقی اِس قابل ہوتے تو اللہ تعالیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے اندر بھیجتا لیکن اللہ تعالیٰ

آپ کو نہ رومیوں میں بھیجتا ہے، نہ ایرانیوں میں اور نہ ہندوستانیوں میں بھیجتا ہے اور نہ افریقیوں میں بلکہ اللہ تعالیٰ آپ کو عربوں میں بھیجتا ہے کیا اللہ تعالیٰ اپنے دین کو تباہ کرنا چاہتا تھا کہ اس نے آپ کو عربوں میں مبعوث فرما دیا؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عربوں میں بھیجا ہی اس لئے تھا کہ وہ جانتا تھا کہ اِس وقت عرب ہی ایک ایسی قوم ہے جو دنیا کی ساری قوموں سے بڑھ کر اپنے اندر قابلیت رکھتی ہے اور اس میں شک وشبہ کی ذرہ بھر گنجائش نہیں ہوسکتی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایک ایسے انسان تھے جو اس بوجھ کو اُٹھا سکتے تھے۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ عرب ہی ایک ایسی قوم تھی جو مستحق تھی اس بات کی کہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجتا اور ان کو فضیلت اسی بات میں ہے کہ ان کے اندر بِالقوہ نیکی پائی جاتی تھی۔ بِالقوہ اسے کہتے ہیں جو کسی کی ذاتی استعداد ہو اور بِالفعل وہ خوبی ہوتی ہے جو ظاہر ہو رہی ہو۔ پس جہاں تک ذاتی استعداد کا سوال ہے اگر کوئی کہے کہ ذاتی استعداد عربوں کے سوا اور قوموں میں بھی تھی تو یہ بالکل غلط بات ہوگی۔ کوئی شخص کہہ دے کہ اگر اسلام ایرانیوں میں جاتا یا رومیوں میں جاتا تو اور بھی ترقیات حاصل کرتا تو یہ بھی قلتِ تدبر کا نتیجہ ہوگا خدا تعالیٰ نے عربوں کو چنا ہی اس لئے تھا کہ وہ دین الٰہی کو انتہائی بلندی پر پہنچا سکتے تھے۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمکی عرب میں پیدائش اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے ماتحت تھی خدا تعالیٰ نے اچھی طرح اس بات کو دیکھ لیا تھا کہ عرب ہی دنیا میں ایک ایسی قوم ہے جو اس بوجھ کے اُٹھانے کے قابل ہے ورنہ خدا تعالیٰ کو یہ بھی طاقت تھی کہ آپ کو ایران یا روم یا ہندوستان یا افریقہ میں پیدا فرماتا۔ پس جہاں تک اُس زمانہ میں بِالقوہ نیکی کا سوال ہے اگر کوئی کہے کہ عربوں سے بڑھ کر کسی اور قوم میں بِالقوۃ موجود تھی تو یہ بالکل غلط بات ہے۔ اسی طرح اِس زمانہ میں سب سے بڑھ کر قربانی کرنے کا مادہ پنجاب کے لوگوں میں پایا جاتا ہے بعض بنگالی کہہ دیتے ہیں آپ پنجابیوں کو کیوں افضل قرار دیتے ہیں؟ تو میں کہتا ہوں یہ تمہاری قلت تدبر کا نتیجہ ہے جو شخص اس پر اعتراض کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پنجاب میں مبعوث فرما کر یہ بتا دیا کہ جو استعداد اور قربانی کا مادہ پنجابیوں کے اندر ہے وہ کسی اور علاقہ کے لوگوں میں نہیں پس اگر کوئی شخص یہ کہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی

بعثت بنگال یا پشاور یا دکن میں ہونی چاہئے تھی تو یہ اُس کی حماقت ہوگی اللہ تعالیٰ ہی سب سے بہتر انتخاب کرسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے جس کو فرسٹ (FIRST) قرار دینا تھا دے دیا اور اس کی نظر نے دیکھ لیا کہ اس وقت پنجاب ہی اِس قابل ہے کہ اس میں مَیں اپنا مامور بھیجوں۔ وہ اچھی طرح اس بات کو جانتا تھا کہ ان کے اندر چھپی ہوئی فضیلت ہے اور ان میں بِالقوہ ترقی کی قابلیت موجود ہے۔

پس جہاں تک اخلاقِ فاضلہ کا تعلق ہے بے شک عربوں میں اسلام سے پہلے نہ تھے لیکن ان کے اندر بِالقوہ نیکی کی استعداد موجود تھی اور ان میں بعض چھپی ہوئی خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بعض زمینیں بظاہر یکساں نظر آتی ہیں لیکن ایک زمین ایسی ہوتی ہے کہ اگر اس پر شبنم بھی پڑ جائے تو وہ غلّہ اُگاتی ہے اور دوسری ایسی ہوتی ہے کہ اگر اس پر متعدد دفعہ بارشیں بھی ہوتی رہیں تو اس میں روئیدگی کی طاقت نہیں آتی۔

پس اللہ تعالیٰ نے عربوں کو اس لئے اپنے دین کیلئے چنا کہ ان میں اس بوجھ کے برداشت کرنے کے لئے قوت موجود تھی اور وہ جانتا تھا کہ جب اس قوم پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چھینٹا پڑے گا ان میں روئیدگی کی وہ طاقت پیدا ہو جائے گی جو کسی اور قوم میں نہیں ہوسکتی۔ پس عربوں کی اس فضیلت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور انکار کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ جان بوجھ کر انکار کیا جا رہا ہے جیسے کہتے ہیں کہ کوئی جولاہا فوج میں بھرتی ہوگیا جب وہ میدانِ جنگ میں پہنچا تو تیر لگنے سے زخمی ہوگیا اور اُس کا خون بہنے لگا۔ وہ خون کو دیکھتا اور بھاگتا جاتا اور کہتا جاتا یا اللہ! ایہہ خواب ہی ہووے۔ یا اللہ! ایہہ خواب ہی ہووے۔ پس عربوں کی فضیلت کا انکار کرنا اس جولاہے کی پیروی کے مترادف ہوگا۔ عربوں نے اس طرح اسلام کو قبول کیا اور پھر ساری دنیا میں پھیلایا کہ دنیا حیران رہ گئی اور وہ ایک قلیل عرصہ میں دنیا کے معتد بہ حصہ پر اسلام پھیلانے کا موجب ہوئے۔ پس عربوں کا بِالقوہ نیکی کا انکار کوئی اندھا ہی کرے تو کرسکتا ہے لیکن عقل اور دماغ رکھنے والا انسان کبھی اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا کہ عربوں کے اندر جو بِالقوہ نیکی موجود تھی وہ اور کسی قوم کے اندر نہ تھی۔

(الفضل ۳، ۵، ۷، ۸، ۹، ۱۲ ستمبر ۱۹۶۱ء)

۱ الروم: ۴۲

۲ داکھ: انگور کی ایک قسم

۳ عِنَب: انگور

۴ المنجد صفحہ ۵۱۸، ۵۱۹ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء

۵ بخاری کتاب التفسیر۔ تفسیر سورۃ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ

۶ البلد: ۷ ۷ البلد: ۷، ۸

۸ طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۲۱۲ مطبوعہ بیروت ۱۹۸۵ء

۹ بخاری کتاب العتق۔ باب عتق الشرک

۱۰

۱۱ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۰۲، ۴۰۳ مطبوعہ بیروت ۱۹۷۸ء

۱۲ الشعراء: ۲۲۰ ۱۳ اٰل عمران: ۵۵